رجب علی بیگ سرور

سالِ ولادت: ۱۷۸۷ء　　　　　　　　　　　　　　　　سالِ وفات: ۱۸۶۷ء

رجب علی بیگ سرور لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سرور کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ سرور نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں پائی۔ عربی اور فارسی میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے موسیقی اور خوش نویسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ علاوہ ازیں خطاطی، تیراندازی، شہ سواری اور شاعری سے بھی خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ شاعری میں سرور نے میر سوز کی شاگردی اختیار کی اور شعر کہنے لگے۔ تاہم سرور کی شہرت کا انحصار ان کی شاعری پر نہیں بلکہ نثر پر ہے۔

۱۸۱۹ء میں اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر نے کسی بات پر برہم ہو کر سرور کو لکھنؤ سے جلا وطن کر دیا۔ چنانچہ سرور لکھنؤ سے کان پور پہنچے اور وہاں اُنھوں نے اپنے دوست حکیم اسد علی کے کہنے پر ''فسانۂ عجائب'' لکھی۔ ۱۸۴۶ء میں سرور، واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے تو واجد علی شاہ نے نہ صرف انھیں معاف کر کے لکھنؤ واپس بلا لیا بلکہ خوب عزت افزائی کی اور درباری شاعروں میں شامل کر لیا۔ ۱۸۵۶ء میں جب سلطنت اودھ پر زوال آیا اور واجد علی شاہ کو بھی اقتدار سے محروم ہونا پڑا تو سرور کو دوسری بار لکھنؤ ترک کرنا پڑا جس کی بنا پر انھیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انھی دنوں مہاراجا بنارس ایشری پرشاد نارائن سنگھ نے سرور کو اپنے پاس بلا لیا۔ مہاراجا علم و فن کا بڑا قدر دان تھا۔ اس نے سرور کو بہت عزت بخشی اور اپنے دربار سے وابستہ کر لیا۔ ۱۸۶۷ء میں سرور نے بنارس ہی میں وفات پائی۔

سرور نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا۔ ''فسانۂ عجائب'' ان کی زندہ و جاوید تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ''سرور سلطانی''، ''شررِ عشق''، ''شگوفۂ محبت''، ''گلزارِ سرور''، ''شبستانِ سرور'' اور ''انشائے سرور'' نے بھی خاصی شہرت حاصل کی مگر جو مقبولیت و شہرت ''فسانۂ عجائب'' کو حاصل ہوئی وہ ان کی دیگر تصانیف کو نہ مل سکی اور اسی کی بنا پر سرور کا نام آج تک زندہ ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' دبستانِ لکھنؤ کی نمائندہ تصنیف ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ حسن و عشق کی داستان ہے۔ اس کا طرزِ تحریر مقفّٰی، مسجع اور پُر تکلف ہے۔

سرور نے ''فسانۂ عجائب'' کی تحریر میں دلکشی و رنگینی پیدا کرنے کے لیے جا بجا فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ و محاورات، نادر تشبیہات، استعارات اور انوکھی تراکیب کا بکثرت استعمال کیا ہے جس کی بنا پر ان کی تحریر بہت بوجھل، پیچیدہ اور دقیق ہو گئی ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' لکھنوی معاشرت اور رسوم و رواج کی آئینہ دار ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ''فسانۂ عجائب'' سرور کی انشا پردازی کا نادر نمونہ اور اہم اردو داستان ہے۔

رجب علی بیگ سرورؔ

فسانۂ سلطانِ یمن

سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اُس کا مالا مال، دولت لازوال، بخشندۂ تاج وتخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکاری: میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اُس کا نزدیک و دور ''خدادوست'' مشہور ہوا۔ ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ اگر تو خدادوست ہے، تو لِلّٰہ تین دن کو مجھے سلطنت کرنے دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بِسمِ اللّٰہ۔ جو ارکینِ سلطنت، مسند نشینِ حکومت حاضر تھے، بہ تاکید اُنھیں حکم ہوا کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتابِ سلطانی ہوگا۔ یہ فرما، وہ فرماں روا تخت سے اُٹھا، سائل جابیٹھا، حکم رانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا: اب قصد کیا ہے؟ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔ سائل بولا: پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ ملا، برائے خدا یہ تاج وتخت یک لخت مجھے بخش دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بہ رضائے خدا یہ حکومت آپ کو مبارک ہو، میں بہ خوشی دے چکا۔ بادشاہت دے کر کچھ نہ ہیہات لیا، فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا: اتنے دنوں سلطنت، حکومت کی، چندے فقیری کی کیفیت، فاقے کی لذّت دیکھیے۔ گو جاہ وحشم مفقود ہے، مگر شاہی بہ ہر کیف موجود ہے، الّا اس شہر میں سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ حکم خدا قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ہے۔ دُنیا جائے دید ہے۔ عنایتِ خالق سے کیا بعید ہے جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا، بلکہ تکلف کا لباس بھی وہ خداشناس بار سمجھا، نہ لیا، اور چل نکلا۔ نیرنگیِ سپہرِ بوقلموں، دنیائے دوں کا یہ نقشہ ہے مصرع:

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است [1]

کل وہ سلطنت، ثروت، کروفر، افسروتاج، آج یہ مصیبت، اذیت، در بہ در، پیادہ پا سفر محتاج۔ کبھی دو کوس، گاہ چار کوس، بے نقارہ و کُوس، بہ ہزار رنج وتعب چلتا۔ جو کچھ میسر آیا تو روزی ہوئی، نہیں تو روزہ۔ یوں ہی ہر روز راہ طے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی، چند روز میں ایک شہر ملا، مسافر خانے میں بادشاہ اُترا۔ اتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارد ہوا۔ قافلہ باہر اُتار، تنہا گھوڑے پر سوار، سیر کرتا مہمان سرا میں وارد ہوا۔ شہ زادی گو کہ گردِ راہ صعوبتِ سفر کی جتلا تھی، لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدیؔ:

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را [2]

سوداگر کی آنکھ جو پڑی، بہ یک نگاہ ازخود رفتہ ہوا، سانس سینے میں اڑی۔ بادشاہ کے قریب آ سلام کیا۔ یہ بے چارے اللّٰہ کے ولی، وہ شقی۔ بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اس عرصے میں وہ غدار حیلہ سوچا۔ بہت فسردہ خاطر ہو کر کہا: اے عزیز! میں تاجر ہوں، قافلہ باہر اُترا ہے۔ میری عورت کو دردِ زہ ہو رہا ہے۔ دائی کی تلاش میں دیرے سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں۔ تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر، اس نیک بخت کو للہ میرے ساتھ کردے، تاکہ اس کی شراکت سے اُس کو رنج سے نجات ملے، وگرنہ بندۂ خدا کا مفت خون ہوتا ہے، آدمی کا مرجانا زبوں ہوتا ہے۔ یہ اللّٰہ کا نام سن کر گھبرائے، بی بی سے کہا: زہے نصیب! جو محتاجی میں کسی کی حاجت بر آئے، کام نکلے۔ بسم اللّٰہ، دیر نہ کرو۔ اُس نے دم نہ مارا، کھڑی ہو گئی، سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل اُس غریب سے کہا: قافلہ دور ہے، مجھے

---

[1] یہ مصرع حافظؔ کا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا کسی سے وفا نہیں کرتی۔ [2] یہ مصرع شیخ سعدی کا ہے جس کا مطلب ہے ''محبوب کے چہرے یعنی خوب صورت چہرے کو کسی سجانے بنانے والی کی حاجت نہیں ہوتی یعنی خوب صورت چہرہ آرائش کا محتاج نہیں ہوتا''۔

آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے، آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تو جلد پہنچیں۔ وہ فلک ستائی فریب نہ جانتی تھی، سوار ہوئی۔ سوداگر نے گھوڑے پر بٹھا، باگ اُٹھائی۔ قافلے کے پاس پہنچ کے کوچ کا حکم دیا، آپ ایک سمت گھوڑا اپھینکا۔ اُس وقت اُس نیک بخت نے داد بیداد، فریاد مچائی۔ تڑپی، روئی پیٹی، چلائی۔ آہ وزاری اس کی، اُس بے رحم، سنگ دل کی خاطر میں نہ آئی۔

بادشاہ پہر بھر منتظر رہا، پھر خیال میں آیا: خود چلیے، دیکھیے وہاں کیا ماجرا ہوا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلا۔ ہر چند ڈھونڈھا، نشان کے سوا قافلے کا سراغ نہ ملا۔ دور گردِ سیاہ اُڑتی دیکھی، جرس اور زنگ کی صدا سنی۔ نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب، سب طرح کا عذاب۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار۔ نہ خدا ترس، نہ فریاد رس۔ بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ یہ کہا، مصحفیؔ:

تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے، تو ہم رہے [1]

لاچار، لڑکوں کو لے کر اُسی طرف چلا۔ چند گام چل کر اضطراب میں راہ بھول گیا۔ ایک ندی حائل پائی، مگر کشتی نہ ڈونگی نہ ملاح۔ نہ راہ سے یہ آشنا، نہ وہاں سیاح کا گزارا۔ کنارے پر دریا کے خاک اُڑا کے ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی تباہی پھرا، رہ بر کامل کو پکارا، ساحلِ مطلب سے ہم کنار نہ ہوا، بیڑا پار نہ ہوا۔ مگر کچھ ڈھبڈھبانے کا ڈھب تھا، گو گھاٹ کڈھب تھا: ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر اُٹھا، دریا میں در آیا۔ نصف پانی بہ صد گرانی طے کیا تھا، کنارے کا لڑکا بھیڑیا اُٹھا لے چلا۔ وہ چلایا، بادشاہ آواز سن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مضطرب جو ہوا، خود غوطے کھانے لگا، لیکن زندگی باقی تھی، بہ ہر کیف کنارے پر پہنچا۔ دل میں سمجھا: بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب کے مُوا۔ نیرنگیِ فلک سے عالمِ حیرت، بی بی کے چھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے الم سے دل کباب، سلطنت دینے سے خستہ و خراب۔

اسی پریشانی میں شکر کرتا پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ درِ شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی، اُدھر آیا۔ اُس ملک کا یہ دستور تھا: جب بادشاہ عازمِ اقلیمِ عدم ہوتا، ارکانِ سلطنت، روسائے شہر وہاں آ کر باز اُڑاتے تھے۔ جس کے سر پر بیٹھ جاتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ یہ روز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے، ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اس بادشاہِ گدا صورت کا پہنچنا، باز اس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے موافق حاضر ہوئے، تخت رو بہ رو آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا، کہا: میں گم کردۂ آشیاں سلطنت کے شایاں نہیں ہوں۔ میں نے اسی علّت سے اپنے مرز بوم شوم کو چھوڑا ہے، حکومت سے منہ موڑا ہے مگر وہ لوگ اس کے سر پر باز کا بیٹھنا عنقا سمجھ، نہ باز رہے۔ جو جو شاہین تھے تاڑ گئے، پر بیں پہچان گئے کہ یہ مقرر ہُمائے اوجِ سلطنت ہے۔ قصہ مختصر، رگڑ جھگڑ تختِ طاؤس پر بٹھا نذریں دیں، توپ خانے میں شلک ہوئی۔ بڑے تزک، حشمت سے آشیانۂ سلطنت، کاشانۂ دولت میں داخل کیا۔ تمام قلمرو، نقد و جنس، اشیائے بحری و بری ان کے تحت حکومت، قبضۂ تصرّف میں آیا۔ گز، سکے پر نام جاری ہوا۔ منادی نے ندا دی، دہائی پھر گئی کہ جو ظلم و جور کا بانی ہوگا، وہ لٹورا، گردن مارا جائے گا، سزا پائے گا۔ سوز:

پل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نشیں
کچھ اچنبھا نہیں اس کا کہ خدا قادر ہے [2]

۱۔ ''اے صبا! قافلے والوں سے کہنا کہ اگر تمھاری یہی رفتار ہے تو ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔''

۲۔ ''وہ (اللہ تعالیٰ) اگر چاہے تو پل بھر میں فقیر کو بادشاہ بنا دے اور یہ کام کوئی حیران کن بھی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر شے اور ہر فعل پر قدرت حاصل ہے۔''

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں، نہ اعتمادِ سلطنت، نہ قیامِ غربت و عسرت۔ مرزا رفیع:

عجب نادان ہیں، جن کو ہے عُجب تاجِ سلطانی
فلک، بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی ا

یہ سلطنت تو کرنے لگا مگر افسردہ خاطر، پژمردہ دل۔ بہ سبب شرم و حیا مفصل حال کسی سے نہ کہتا تھا، شب و روز غمگین و اندوہ ناک پڑا رہتا تھا۔ جب وہ بلبلِ ہزار داستاں یعنی فرزندِ شمعِ دودماں یاد آتے تھے، دن کو پیشِ چشم اندھیرا ہو جاتا، ظلِ سبحانی کو، کو، کر کے نالہ و فریاد مچاتے تھے۔

(فسانۂ عجائب)

ا۔ یہ شعر سودا کا ہے جس کا مطلب ہے "وہ عجیب طرح کے بے وقوف لوگ ہیں جو شاہی تاج یعنی اقتدار پر تکبر کرتے ہیں۔ آسمان (زمانہ) اگر چاہے تو پل بھر میں ہما کے پر کو (جسے بادشاہوں کے تاج میں ہونا چاہیے) مکھیاں اڑانے کی خدمت سونپ دے۔"

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- یمن کے بادشاہ کو لوگ "خدادوست" کیوں کہتے تھے؟
ii- بادشاہ نے کیا کہہ کر اپنی سلطنت سائل کو دے ڈالی؟
iii- بادشاہ کے دونوں بیٹوں پر کیا گزری؟
iv- بادشاہ کو دوسرے ملک کی بادشاہت کس طرح مل گئی؟

2- درست بیان کے سامنے (✓) اور غلط بیان کے سامنے (×) کا نشان لگائیں:

i- "فسانہ سلطانِ یمن" فسانہ عجائب کا اقتباس ہے۔
ii- "فسانہ عجائب" حیدر بخش حیدری کی تصنیف ہے۔
iii- "فسانہ عجائب" کی زبان پر تکلف ہے۔
iv- "فسانہ عجائب" میں پنجاب کا ماحول پیش کیا ہے۔

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ ملا۔
ii- تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر۔
iii- جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکاری: میں بر آئی۔
iv- کنارے پر دریا کے خاک اڑا کے ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی تباہی پھرا۔

4- قافیہ دار عبارت یعنی جس میں قافیوں کا استعمال ہو، مقفیٰ عبارت کہلاتی ہے۔ "فسانہ عجائب" میں بے شمار مقفیٰ جملے ہیں۔ مثلاً ملک اس کا مالا مال، دولت لازوال، بخشندۂ تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندۂ بخت۔"
اسی طرح کے پانچ اور مقفیٰ جملے "فسانہ عجائب" کے پڑھے ہوئے حصے میں سے منتخب کر کے لکھیں۔

5- "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کے اقتباسات آپ نے پڑھے۔ بتائیں ان میں زبان و بیان کا واضح فرق کیا ہے؟

6- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم لکھیں:
بخشندۂ تاج و تخت، موردِ عتابِ سلطانی، ثروت، اذیت۔

☆......☆......☆

ناول

ناول (Novel) اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نئی یا انوکھی چیز کے ہیں۔فنی اصطلاح میں اس سے مراد ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمول کے واقعات اور روز مرہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دل چسپی پیدا ہو۔ یہ دل چسپی پلاٹ، منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری خاص طور پر اہم ہیں۔

ناول میں پلاٹ ایک نقشے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ناول نگار کرداروں اور مکالموں وغیرہ کے ذریعے سے رنگ بھرتا ہے۔ ناول کی کامیابی کا بڑا انحصار ناول کے پلاٹ پر ہوتا ہے جس پر پورے ناول کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ پلاٹ کے آغاز میں ناول نگار اپنے کرداروں اور واقعات کا تعارف دل چسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں کرتا ہے۔ پلاٹ کے دوسرے حصے میں واقعات یا کرداروں میں تصادم رونما ہوتا ہے جو واقعات کو نقطۂ عروج پر لے جاتا ہے۔ تیسرے حصے میں واقعات اس حد تک الجھ جاتے ہیں کہ وہ قاری کی توجہ اور جذبات کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ خواہش کرنے لگتا ہے کہ ان الجھنوں کا جلد فیصلہ ہو۔ چوتھے حصے میں واقعات کی الجھنیں ختم ہونے لگتی ہیں اور آخری حصے میں ناول اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

جس طرح ناول میں کچھ واقعات کی ضرورت ہوتی ہے جو اشخاص کو پیش آئیں، اسی طرح ناول میں کچھ اشخاص کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کو بعض واقعات پیش آئیں۔ چونکہ ناول انسانی زندگی کی عکاسی کرتا ہے، اس لیے اس کے کردار بھی عام انسان ہوتے ہیں جن میں اچھے اور برے بھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ناول کے کرداروں کو مثالی نہیں ہونا چاہیے بلکہ حقیقت کے قریب ہونا چاہیے۔

اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے کرداروں کی گفتگو کو مکالمہ کہتے ہیں۔ اچھے ناول نگار کے کردار اُسی طبقے کی زبان بولتے ہیں جس طبقے سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ ان پڑھ مزدور اگر عالموں فاضلوں جیسی گفتگو شروع کر دے تو اسے مکالمے کا عیب سمجھا جائے گا۔ کرداروں کے مکالموں کا مختصر، چست اور موثر ہونا ضروری ہے کیونکہ مکالمے اگر طویل ہوں گے تو ان پر تقریر کا گمان ہوگا۔

ناول نگار کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے جسے وہ ناول میں بیانیہ انداز میں یا کرداروں کی گفتگو کے ذریعے سے اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ناول پڑھتے ہوئے قاری کو ناول نگار کے مستور فلسفۂ حیات سے آگاہ ہونے کا موقع ملتا ہے لیکن ناول نگار کو براہِ راست خطاب کرنے یا وعظ کرنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ قاری اس سے اچھا تاثر نہیں لیتا۔

منظر نگاری بھی ناول کے عناصر ترکیبی کا ایک اہم جز ہے کیونکہ بعض مناظر واقعات کو موثر بنانے اور کرداروں کی شخصیت کو واضح کرنے میں اہم پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ اچھا ناول نگار اپنے ناول کے مختلف مناظر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کی مکمل تصویر آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے ناول نگار کو تجسس کا سہارا بھی لینا چاہیے۔ مزید براں ناول کی کہانی میں چونکہ ایک سے زیادہ واقعات ہوتے ہیں اس لیے ناول نگار کا فرض ہے کہ وہ ان واقعات میں منطقی ربط قائم رکھے۔

اردو ادب میں ناول کی صنف انگریزی کے توسط سے آئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد رتن ناتھ سرشار نے ''فسانۂ آزاد'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔ عبدالحلیم شرر اپنے تاریخی ناولوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' لکھ کر ناول میں حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی۔ پریم چند نے ناول لکھ کر اس کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ کرشن چندر کا ''شکست''، عصمت چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر'' عزیز احمد کا ''گریز'' اور شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' ناول نگاری میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی بہت سے اچھے ناول لکھے گئے جن میں قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، جمیلہ ہاشمی کا ''دشتِ سوس''، فضل احمد کریم فضلی کا ''خونِ جگر ہونے تک''، عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' اور بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' اہم ہیں۔